Tauseeq, Volume. 4, Issue. 2
ISSN (P) 2790-9271 (E) 2790-928X
DOI: 3https://doi.org/10.37605/tauseeq.v4i2.59

Received: 16-10-2023
Accepted: 13-11-2022
Published: 31-12-2022

آغا گل کے ناول بیلہ کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical study of AghaGul's Novel Bela

فرزانہ خدرزئی*

Abstract:

Agha Gull painted the civilization and culture of Balochistan in his fiction.He wrote four novels.Bella regarding the layout of the second novel.Novel was the source of the world's schlorship with the traditional science regarding the label.In the novel ,it was a new linguistic experience.The fact that this narrative statement describes the traditional romance story,but indeed reflects the economic,social and educational equality of the Balochistan.The reformative aspest of this novel is to shape the character of the young generation by taking them out of sentimentality and ambivalence.In order of eradicate ignorance they have to be trained by attracting them towards eduction.Through this novel,Agha Gul has highlighted the social and societal tragedies spread around in an intangible way.In this novel, the civilization and culture of Balochistan is also present in the features of a travelogue.The reader enjoys the travelogue while reading it.

Keywords: Balochistan, fiction, traditional, linguistic, culture, travelogue, civilization

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ماضی کی تحقیق میں اگر کہیں کمی یا حقائق سامنے لانے میں کوئی کوتاہی ہو تو ضروری ہے کہ اس کوتاہی کا نئی آنے والی تحقیق میں ازالہ کیا جائے مگر ادب میں بے اعتناعی کی ایسی کئی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جس میں کسی ادیب یا تخلیق کار کی تخلیق کے کسی ایک پہلو پر توشد و مد کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے مگر دوسرے پہلو کو نظر انداز کیا جاتا۔ جیسے سید عابد علی عابد اردو کے اہم

* اسسٹنٹ پروفیسر اردو گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج جناح ٹاؤن کوئٹہ

نقاد ہیں تنقید کے حوالے سے کئی اہم کتب لکھیں مگر ایک طویل عرصے تک بطور نقاد ان کی خدمات کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ آغا گل کی افسانہ نگاری کو تو سراہا جاتا ہے مگر ناول نگاری کے حوالے سے ایک عرصے تک تحقیقی کتب میں ان کا تذکرہ کم ہی دکھائی دیا۔"بلوچستان میں اردو زبان وادب"میں ڈاکٹر فاروق احمد لکھتے ہیں:

> "آج کے اردو ادب میں ناول نگاری پر وہ توجہ نہیں دی جارہی جس کی یہ صنفِ ادب تقاضا کرتی ہے۔ دراصل ناول لکھنے کے لیے دل جمعی کے ساتھ ساتھ وسعت مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور فنی لوازمات کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ زندگی کو مکمل انسانی رویوں، تاریخی، سیاسی اور تہذیبی حوالوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔"(1)

عطاشاد نے شاعری میں جس فنی و فکری اور تہذیب و ثقافت کی تصویریں پینٹ کیں وہی کام آغا گل نے فکشن میں کیا۔ بلوچستان میں ناول پر کثرت سے قلم اٹھایا گیا مگر بلوچستان میں تخلیق کاروں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں مختلف رائیٹرز لابیاں متحرک ہیں، ہر مخصوص لابی مخالف لابی سے تعلق رکھنے والے تخلیق کار کی تخلیق کا گلا گھونٹ کر ادبی دنیا میں ابدی نیند سلا دیتے ہیں۔ دوسرا یہاں تحقیق کی کمی جس کے سبب درست حقائق بہت کم ہی سامنے آسکے۔ ناول نگاری کے اعوان پر بلوچستان کے حوالے سے تنزلی کے احساس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ سوائے ایک ناول، بلوچستان کا مجبور بد معاش کے باقی خواتین کے لکھے گئے ناول ایک مخصوص حصار میں قید دکھائی دیتے ہیں اور جمود کی کیفیت کا شکار ہیں یہی وجہ ہے کہ اب تک بلوچستان میں ناول نگاری کے موضوع پر بیرون بلوچستان بھی یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ بلوچستان میں ناول کی صنف پر کم ہی لکھا گیا۔ منزہ جبین "آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب و ثقافت" میں لکھتی ہیں:

> "بلوچستان میں ناول نگاروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلوچستان کے ادیبوں نے ناول نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی۔"(2)

اس صنف کی بھاری فصیل پر شگاف ڈالنے کی سعی آغا گل نے کی۔ اس تخلیق سے انہوں نے صنف ناول کو معمول کی سطح سے اوپر اٹھا کر بلندی کی سطح پر پہنچا دیا۔ ان کی ادبی قد و قامت میں نہ صرف غیر معمولی اضافہ ہوا بلکہ اس کی اشاعت کے بعد ہی بلوچستان میں اچھے، ادبی اور میعاری ناول لکھنے کا رجحان شروع ہوا۔ ان کے ناولوں میں نہ صرف انسانی رویوں، تہذیبی شعور کا ادراک ملتا ہے بل کہ

تاریخی اور سیاسی عوامل پر ان کی عمیق نگاہ اور مغربی ادب کا مطالعہ انہیں نہ صرف بلوچستان کے صفِ اول کے ناول نگاروں میں لا کھڑا کر کے بین الاقوامی سطح پر بھی متعارف کرواتا ہے۔

عالمی سطح پر ادب میں بڑی تبدیلی نائن الیون کے بعد دیکھی گئی۔اسی تناظر میں دیکھا جائے تو بلوچستان کے مخصوص دگرگوں حالات، معاشی کش مکش، مظلوموں پر سرمایہ دارانہ طبقے کا ظلم و استعداد ناخواندگی و افلاس بھری زندگی نائن الیون کی طرح بلوچستان کے ادبی منظر نامے کو بدل دیتی ہے۔اس سے قبل بلوچستان کے ناولوں میں روایتی رومانی عشقیہ رجحانات کا عنصر غالب تھا، یا پھر ولور، لب، قبائلی رسم و رواج، جائیداد کے تنازعے، جنسی موضوعات، دینی اور اخلاقی قدروں کو سامنے لایا گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ناول نگاری کے اعوان میں خواتین کی ایک کثیر تعداد ناول تخلیق کر رہی تھی۔ان خواتین کا بھی عالمی ادب اور سیاسی حالات کے حوالے سے مطالعہ محدود تھا۔ تاہم آغا گل نے بلوچستان کے ناولوں کو ایک مخصوص لگی بندھی فضا سے نکال کر ناول نگاری میں جدت کی طرف قدم بڑھائے۔انہوں نے اپنے ناول میں خوف اور بے سمتی، باطنی اور خارجی امتزاج نے فرد کو بہ طور انسان اپنے ہونے اپنی شناخت اور اپنے حوالے سے کچھ کر گزرنے کی کیفیت کو اجاگر کیا۔ ساتھ ساتھ اجتماع اور زمین کی اہمیت کو واضح کیا۔ سیاسی و معاشی خونی بحران کا احوال سناتا یہ ناول بلوچستان کی پوری تہذیب و تمدن کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

کسی بھی فکشن کا تجزیہ کرتے وقت اس بات کا خصوصی طور خیال رکھا جاتا ہے کہ اگر وہ ایک مخصوص علاقے یا قوم کا احوال سچائی اور حقیقت مندانہ انداز میں پیش کر رہی ہے تو میعار مقرر کرتے وقت یہ مہر ثبت کی جاتی ہے کہ مخصوص جغرافیائی حدود و قیود میں پیش کردہ اس تحریر کو عالمی ادب کے تناظر میں پرکھا نہیں جا سکتا انہوں نے ناولوں میں بلوچستان کے سیاسی، معاشی حالات، دہشت گردی کا احوال سناتے ہوئے یہاں کی تہذیب و تمدن کی حقیقت پسندانہ انداز میں عکاسی کی مگر اس جغرافیائی حدود و قواعد کے باوجود انہیں عالمی سطح پر پذیرائی ملی کہ تخلیقی تجربے کی اس سطح نے اس ناول کو لازماں کر دیا۔ انہوں نے مغربی فکشن کا گہرائی سے مشاہدہ کیا جس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً مختلف ناموں، کرداروں کو بہ طور مثال پیش کرنے سے جھلکتی ہیں۔ انگریزی الفاظ بھی ناول میں استعمال کیا ہے جو اس پہلے بلوچستان کے ناولوں میں نہیں کیا جاتا تھا بعد میں آنے والے تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات میں اسی روش کو اپنایا۔ وہ اپنے دور سے مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ وہ دور، جس کا سب سے بڑا المیہ غیر متزلزل حالات اور فکرِ معاش ہے جو قدروں کی شکست سے پیدا ہوتے ہیں۔ بلوچستان میں ترقیاتی منصوبوں میں رکاوٹ او، جہالت، غربت، تعلیمی دوری کا احساس، ان واقعات نے ان کے اندر کے تخلیقی انسان کو متاثر کیا۔

آغا گل نے اب تک ،دشتِ وفا، بیلہ، بابو اور فسانہ جنات چار ناول لکھے ہیں۔ بیلہ ان کا کا دوسرا ناول ہے ۔یہ ناول ۲۰۰۲ع میں قلات پبلیشرز کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا۔۲۰۰۷ع میں دوسری جب کہ سال ۲۰۰۸ع میں تیسری مرتبہ اشاعت کے مرحلے سے گزرا۔ناول میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے ناول میں ہونی چاہیں۔اس ناول میں انہوں نے جس تکنیکی، پیشہ وارانہ زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا وہ ایک نیا لسانی تجربہ تھا۔ ان تجربوں کا سلسلہ اس کے ہر نئے آنے والے ناول میں نظر آتا ہے۔ایک بیوروکریٹ فکشن رائیٹر کس طرح ڈرائیوروں کی فنی زبان سے آگاہ ہو سکتا ہے؟ مگر انہوں نے عوامی لب ولہجے، بول چال کے انداز سے فنی مہارت کا بھرپور ثبوت دیا۔ محاورات، تشبیہات اور استعارات کا استعمال بھی پیشہ وارانہ انداز میں کیا گیا۔ ہر کردار کی زبان و مکالمہ اس کردار کو مد نظر رکھ کر لکھا گیا۔ دل کا انجن، محبت کا چوبیس وولٹ بیٹری والا نور، دل کی وہیل الاٹمنٹ، دل کا ایڈی ایٹر، دل کے Tapped، دل کا آر پی ایم، بریک لائیٹ سے چہرے کا گل رنگ ہونا، ماتم ہوائوں کا گیراج، مایوسی کا ڈیزل، دماغ کا کلچ، زبان کا کلچ اور بریک، محبت کا ایکسلیٹر، دل کا کوچ، محبت کی ہیڈلائیٹس، محبت کی بڑھتی سپیڈ، انجن کے کرینک کی طرح مسلسل چلتی زبان، آنکھوں کا وائپر بلیڈ، آنکھوں کی ڈائون ہوتی بیٹری، شہروں کا بغیر ٹائر ٹیوب کے پھیلائو، دل کے میٹر میں H کی جانب بڑھتا جھکاؤ، پرانے ٹائروں کی طرح میلی آنکھیں، بریک لائیٹ کی طرح گلرنگ ہوتا گلابی چہرہ، جیسے الفاظ، استعارات و تشبیہات فطری بہاؤ بن کر اس مخصوص روزگار سے جڑے انسانوں کے داخلی، نفسیاتی اور روحانی مسائل کا مشاہدہ ایک مختلف نقطہ نگاہ سے سامنے لاتے ہیں ۔ان میں سے ہر ایک لفظ اپنے اندر باقاعدہ ایک تاریخ، ایک تہذیب کو سمیٹے ہوئے ہے۔اس میں برتی جانے والی تشبیہات و استعارات حسی کیفیات کے حرارت آمیز تاثر کو پیدا کرتی ہیں جن میں جنسی اظہار کی کی کیفیت بھی ملتی ہے۔

"خوبصورت عورتوں کے جسموں کی گولائیاں، جیسے تسبیح کے دانے۔"(3)

اندھیرے کا کمبل اوڑھے سوراب، کوئٹہ سانپ کی کنڈلی، سارا وان کی جانب بڑھتا لہراتا سانپ، میدان حشر کا نظارہ پیش کرتے بس اڈے، آدم خور مگرمچھ کی طرح انسانوں کو نگلتا کوئٹہ ، کوہ مردار کے عقب میں کروٹیں بدلتا سورج، سونے دل کی طرح بلوچستان کے ویران سواحل، گواڑخ کی شکل میں پتھریلی بنجر زمین پر نمودار ہوتا شہیدوں کا سرخ لہو، سوراب کی ٹمٹماتی روشنیاں جیسی تشبیہات و استعارات بلوچستان کے ارد گرد کے ماحول سے اخذ کی گئی ہیں۔ نسوانی شخصیت کی عکاسی و تفہیم کے لیے داخلی زاویہ نظر سے دیکھنے کے

قائل نہیں ہیں، بل کہ خارجی نشیب و فراز کو کبھی اشارتا تو کبھی استعاروں اور امیجز کے نئے، کم متاثر کن معیار کی تشکیل سے پیش کرتے ہیں۔

" پہلی نظر میں تو وہ ایک خوبصورت من موہنی کلینر لگی۔ مگر بمپر آگے پیچھے کے پکار رہے تھے کہ لڑکی ہے۔"(4)

جہاں جہاں ایسے مناظر سامنے لاتے ہیں، جنس انگیز جسمانی تمثالیں تخلیق کر کے جبلتوں کا برملا اظہار کرتے ہیں تو ان محرکاتی قوتوں کا ذکر ذہنی آسودگی کی شکل میں متشکل ہوتا ہے:

"ایسی صحت مند لڑکیوں کو عقب سے چلتے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے دو oval ٹائر ایک ہی رم پر چل رہے ہوں۔ جیسے دو کوئچ ایک تنگ تھیلی میں جکڑ رکھے ہوں۔"(5)

اسلوب کے حوالے سے اس ناول میں روایتی اسلوب سے انحراف کر کے نئے رجحان کو پیدا کیا۔ ٹرانسپورٹ کمپنی سے وابسطہ علامتی زبان کی وساطت سے سراپا نگاری کرتے ہوئے بسا اوقات اخلاقی حدود پھاند لیتے ہیں، ایسے میں ان کا اسلوب کھٹکنے لگتا ہے:

"شاید ٹو ان ون ہے ورنہ ایسی خاص بات کیا ہے؟ ایسی ہیڈ لائیٹ ایسا فریم، ایسے بمپر تو ہر لڑکی کے ہوتے ہیں۔"(6)

ایسے ہی ذو معنی، معنی خیز اسلوب میں گہری سے گہری بات آرام سے کہہ جاتے ہیں:

" عبد الرحمان کی تو عبد الرحمنیاں۔۔۔ میں تو سمجھا رحمان ذوق ایرانی۔۔۔"(7)

بیلہ کے لیے بیلہ ڈونا کی نئی اصطلاح واضع کی وہ ناول کے کردار ڈاکٹر سرور کے توسط سے اس اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں خواتین بیلاڈونا دوائی کا آنکھوں کی خوبصورتی میں اضافے کی لیے استعمال کرتیں۔ کیوں کہ اس کے استعمال سے آنکھوں کی پتلی پھیل جاتی بیلا کا مطلب ہے خوبصورت جب کہ ڈونا کا مطلب ہے عورت یعنی بیلاڈونا کی اصطلاح خوبصورت عورت کے

لیے وضع کی گئی ہے۔ڈاکٹر سرور، ناول کے مرکزی کردار رحمان سے کہتا ہے کہ میں اسی بیلا ڈونا کا اثر تمھاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں جو عورت اور مرد کا ملا جلا شاہ کار ہے۔ول کے تمام کرداروں کا سب سے اہم اور مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ تمام کردار خالص انسان ہیں، نیکی اور بدی کا مرقع، فطری، زمین پر بسنے والے جن کا عام زندگی میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔یہ تمام کردار اپنے اپنے طبقہ کی بھرپور نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس ناول کی کہانی رحمان سے شروع ہوتی ہے جو ایک کوچ ڈرائیور ہے۔اس کے والد اور چچا بلوچستان میں گوریلا جدوجہد کے خلاف حقوق کی بحالی کے لیے چلائی جانے والی تحریک سے وابستہ تھے۔پکڑ دھکڑ سے بچنے کے لیے انہوں نے پہاڑوں پر پناہ لے رکھی تھی اور ایسی ہی خون آلود جھڑپ میں شہید کیے گئے۔ان کی موت کا علم دو ماہ تک نہیں ہو سکا۔پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے اس کی ماں نے اپنا سارا زیور بیچ ڈالا۔جب نوبت فاقوں تک آ پہنچی تو ڈرامائی انداز میں سیٹھ شمروز کی آمد ہوئی جو ایک کوچ کمپنی کا مالک ہے۔اس نے رحمان کو ئٹہ سے کراچی اور کراچی سے کوئٹہ چلنے کوچ میں بطور کلینر رکھا۔اپنی سچائی، ایمان داری اور لگن سے کام کی بہ دولت وہ جلد ہی شمروز کے دل میں گھر لیتا ہے اور ڈرائیور کی سیٹ سنبھال لیتا ہے۔بیلہ سے اس کی ملاقات اسی کوچ کے توسط سے ہوئی۔وہ میڈیکل کی طالبہ ہے۔اس نے بہت سے خواب آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے بوڑھے ماں باپ کا سہارا بننے اور بہنوں کا بھائی بننے کے لیے لڑکوں والا حلیہ بنا رکھا تھا۔والد مالی بحران کا شکار تھے۔وہ ڈاکٹر بن کر ان تمام مسائل کا تدارک کرنا چاہتی تھی جس کا اس کے خاندان نے زندگی بھر سامنا کیا:

> "ڈاکٹر بننا میرا جہاد ہے میرے والد چند سال میں ریٹائر ہو جائیں گے۔سارے خاندان کی ذمہ داری مجھے نبھانا ہو گی۔گیس کے بلو بجلی کے بل، بہنوں کی تعلیم پھر ان کی شادیاں۔والدین کا علاج۔"(8)

اگرچہ یہ ناول رحمان اور بیلہ کی رومانی کہانی کو بیان کرتا ہے مگر درحقیقت یہ بلوچستان کے خونیں حالات، بھوک اور اس کے تناظر میں ابھرنے والی مہنگائی، بے روزگاری، کسمپرسی، محرومی، مجبوری اور تعلیمی و تعمیری ترقی کی راہ میں حائل عوامل کی عکاسی بھی کرتا ہے۔غلام و محکوم اور مالک و آقا کی لڑائی میں محکوم کے ہاتھ سوائے محرومی اور جان کی قیمت کی ادائیگی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔محکوم اگر لڑنے بھڑنے اور نظام سے ٹکرانے کی بہ جائے مصلحت پسندی سے کام لیں اور خود اس نظام کا حصہ بن جائے تو بہت بڑی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔اس کہانی کا ایک پہلو نوجوانوں کو جذباتی پن سے نکالنا اور مصلحت پسندی پر مبنی سیاست کی طرف راغب کرنا ہے کیوں اس غیر

مصالحانہ رویوں نے بلوچستان کو سب سے زیادہ پس ماندگی کی طرف دھکیلا۔ کوسٹ گارڈ اور رحمان کے تصادم کے بعد سیٹھ شمروز جو بلوچستان میں خوش حالی دیکھنا چاہتا ہے جو ایک نظریاتی انسان ہے، رحمان کی کردار سازی کرتے ہوئے کہتا ہے:

"تمھارا باپ پہاڑوں میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ ہم اس کا احترام کرتے ہیں مگر سوچو وہ کوسٹ گارڈ کا افسر بھی تو بن سکتا تھا۔ وہ اس نظام میں شامل ہو کر اس نظام کو بدل بھی تو سکتا تھا۔"(9)

اس ناول میں آغا گل بزبان سیٹھ شمروز، رحمان کو ناصحانہ انداز میں مثالوں سے فلسفیانہ انداز میں سمجھاتے ہیں کہ نظام سے کنارہ کشی کرنا مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ خود اس نظام کا حصہ بن کر اس کے دائرہ کار کو پھیلا کر بلوچستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا چاہیے۔ اس حصے میں ان کے ناول میں ناصحانہ و ترغیبانہ انداز فکر ابھرتا ہے۔ آغا گل اگرچہ براہ راست کسی تحریک سے وابسطہ نہیں ہیں لیکن یہاں لاشعوری طور پر ان کے ہاں سرسید تحریک کے علاوہ تحریک اقبال سے وابستگی محسوس کی جاسکتی ہے۔ انیسویں صدی میں افکار و نظریات کی جو تحریکیں چلیں ان کی بازگشت آنے والے ادب میں باآسانی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ بلوچستان کے نوجوانوں کو جذباتی پن سے نکال کر رہ نمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں جو انہیں جداگانہ حیثیت سے متعارف کرواتا ہے۔ یہ ناصحانہ انداز کبھی سیٹھ شمروز، کبھی ڈاکٹر سرور تو کبھی کامریڈ کی صورت میں ابھرتا ہے۔

آغا گل نے اس ناول میں بلوچستان کے لوگوں کو کسی نہ زاویے پر ایسے اقدامات کی ترغیب دی جن سے فلاح کا پہلو نکلتا ہے۔ وہ بلوچستان کی ایسی عہد ساز شخصیات کی فہرست گنواتے ہیں جنہوں نے بطور احتجاج سرکاری ملازمتوں کو خیر باد کہا یہ افسران جو عطاء اللہ ولہاری اکبر خان کاکڑ، عبداللہ جان جمالدینی، کمال خان شیدائی جن کا سرکاری عہدوں پر رہنا قوم کے مفاد میں بہتر تھا، اسی طرح وہ قوم کی تقدیر بدل سکتے تھے۔ انہیں پس ماندگی کی اتھاہ تاریکیوں سے نکال سکتے تھے مگر انہوں نے لٹ خانہ بنا کر نظریاتی تعلیم دینے کو ترجیح دی۔ آج وہ نظریات قوم کی حالت بدلنے میں کس حد تک بارآور ثابت ہوئے۔ مستعفی ہونے کی بہ جائے اگر حکومت میں رہ کر کام کرتے تو یقیناً آج حالات کا کچھ اور ہی رنگ ہوتا۔ سیٹھ شمروز کے کردار کے حوالے سے حبیب الرحمن، آغا گل کے ناولوں میں اردو کی تشکیل نو میں لکھتے ہیں:

"بیلہ میں آغا گل نے سیٹھ شمروز کا کردار اپنا پیغام رساں بنا کر تخلیق کیا ہے۔ یہ کردار ایک جہاندیدہ شخص کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ سیٹھ شمروز وہی مکالمے کہتا ہے جو آغا گل بلوچستان کے نوجوانوں سے کہنا چاہتے ہیں۔"(10)

ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ ایک عام انسان بھی ہے۔جب دہشت گرد اس کے لخت جگر کا خون ناحق بہاتے ہیں تو اس کی سوچ کا دائرہ بھی محدود ہو جاتا ہے وہ اعلیٰ ظرفی کا مرتکب ہونے کی بجائے ایک عام انسان کے کردار میں ڈھل جاتا ہے، جو دشمن کے بے گناہ بیٹے کے قتل پر طمانیت محسوس کرتا ہے۔ قانونی کاروائی کی بجائے وہ اصل دشمن کی موت کا بھی خواہاں دکھائی دیتا ہے۔یہاں اس کی عظمت کا دراز قد پستی کی جانب سفر اختیار کرتا ہے، جو محسنوں کو سر کا تاج بنانے کے قائل ہے اور دشمنوں بے بسی اور لاچاریت پر اسے از حد خوشی میسر آتی ہے۔

انیسویں صدی کے نصف میں سرسید اسباب زوال امت کی کھوج لگانے میں مصروف ہوئے، اور اپنی بصیرت، بصارت وسیع مطالعے سے قومی خدمت کو زندگی کا شعار بنایا حالات کا حقیقی تجزیہ کرنے کے بعد ان پر منکشف ہوا کہ مسلمانوں نے غیر مصالحانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے اور انگریز دشمنی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے تو انہوں نے اپنے نظریات و افکار سے حکومت سے متصادم ہونے کی بجائے مغربی علوم کے حصول کے لیے انگریزوں سے مفاہمت کی راہ کو ہموار کیا۔ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو تنقید کا ارتقاء میں سرسید کی اس اصلاحی و تعلیمی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس کے لیے انہوں نے مضامین لکھے، رسالے جاری کیے، تعلیمی کمیٹیاں قائم کیں، مدرسے کھولنے کی کوشش کی، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لائے اور پھر آخر میں مسلم یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی ایک دوسرے راستے پر گامزن ہو گی۔"(11)

ان حالات نے ادب پر بھی گہرے اثرات ثبت کیے۔بدلتے ہوئے حالات کا شعور ادیبوں کو بھی ہونے لگا اور وہ اپنی تحریروں میں شعوری و لاشعوری طور پر اصلاح معاشرہ سے کام لینے لگے۔یوں ادب میں اصلاحی اور تعلیمی رجحانات کے تحت فکری رو بہنے لگی۔بیلہ میں اصلاح کا یہ انداز دو زاویوں سے ابھرتا ہے، سرسید کی طرح مفاہمت پر مبنی سیاست کی تبلیغ اور دوسرا علی گڑھ اسکول و سائنٹفک سوسائٹی کی طرز پر رحمان کا اسکول کھول کر نیا فکری زاویہ فراہم کرنا، جس کے تانے بانے سرسید تحریک سے بالواسطہ اور بلاواسطہ پیوست ہوتے ہیں۔Tower of london اسی بدلتی فکر کی رو ہے جس نے بلوچستان میں جدید مغربی رجحان کو پروان چڑھایا، البتہ یہ نام طنزاً رکھا گیا ہے ۔برطانیہ کے دانش وروں نے آزادی کے متوالوں کو ٹاور میں قید کر کے رکھا مگر علم کی روشنی پھیلانے والا یہ ٹاور قید کرنے کی بجائے شعور و

آگاہی فراہم کرتا ہے آزادی دلاتا ہے۔ جہالت کے جیل توڑتا ہے۔ مصلحت پر مبنی سیاسی رویے کا ادراک زبانوں پر چھیڑی بحث میں بھی باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

آغا گل زبانوں کے استعمال کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ ایک ماہر لسانیات کی طرح اس موضوع پر مختلف زاویوں سے اپنے فکشن میں روشنی ڈالتے ہیں۔ جن کے ذریعے زبان کی ماہیت، تشکیل ارتقاء زندگی اور موت سے متعلق آگاہی ہوتی ہے۔ اس موضوع کی وساطت سے تاریخ، تہذیب، اور معاشرت کے مسائل کو حل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب بھی کسی تہذیب و معاشرت میں تبدیلی آتی ہے تو زبانیں بھی تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہیں، ہر زبان کا ایک دور ہوتا ہے جو کبھی مرضی سے تو بھی جبری طور پر تھوپا جاتا ہے۔ زبانوں میں کبھی سنسکرت، کبھی فارسی کبھی اردو اور کبھی انگریزی کا دور چلتا ہے۔ یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب فرسودہ روایات رد ہوتے ہیں اور نئی تہذیبی شعور کی بے داری عمل میں آتی ہے، معاشرتی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق زبان کو ضرورتاً برتا جاتا ہے۔ کیوں کہ اسی میں بقا کا فلسفہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کے ہر ناول میں زبان کی الجھی گتھیوں کو سلجھانے کی سعی کے ساتھ اس موضوع پر کثرت سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ناول میں رحمان کا کردار ایک ایسے انسان کا تعارف کراتا ہے جو جاگتا ہوا شعور رکھتا ہے جو بلوچستان کی سیاسی صورت حال سے آگاہ ہو کر اپنا رشتہ معاشرے کی تعلیمی تربیت سے جوڑتا ہے۔ انقلابی سوچ رکھنے والا ہے۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کے مسائل کی سب سے بڑی وجہ تعلیم سے دوری ہے۔ صوبے میں پھیلی تاریکی کو علم کی روشنی سے ہی منور کیا جاسکتا ہے۔ کامریڈ کی باتوں نے اسے بصیرت عطا کی کہ بلوچستان کے وہ علاقے جن میں ہائی اسکول کھولے گئے جیسے ۱۹۸۸ع میں سبی میں بارنس ہائی اسکول قائم ہوا پھر نوشکی، تربت جیسے دور افتادہ علاقے اسکولوں اور کالجز کی نسبت سے معروف و مقبول ہوئے، مستونگ کا ہائی سکول، ان شہروں، سکولوں اور کالجوں میں ایک ربط ہے، گہرا تعلق ہے۔ سبب اور مسبب کا یہی تعلق ترقی سے ہم کنار کرتا ہے۔ جہالت اور فرسودہ روایات کو تعلیم سے ہی توڑا جاسکتا ہے۔ پھر یہاں کی بااثر شخصیات ہمیشہ تعلیمی راہ میں رکاوٹ بنیں تاکہ انہیں شعور و آگاہی سے بے بہرہ رکھ کر ان کا استحصال کیا جا سکے اور اپنی ان کوششوں میں انہیں ہمیشہ کامیابی حاصل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں عام آدمی پر ظلم توڑے گئے مگر حقوق کی بحالی کا ادراک نہ ہونے کی وجہ سے اپنے اوپر ڈھائے مظالم کو سہتا رہا۔ بیلہ سے محبت کے ساتھ ساتھ یہ احساس کمتری بھی اس کے دل و ذہن کے نہاں خانوں میں چھپا ہوتا ہے کہ بیلہ ایک ڈاکٹر ہے جب کہ وہ محض ایک کوچ ڈرائیور کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے جس کی کوئی شناخت نہیں اور نہ

ہی وہ معاشرے میں سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ اپنے اندر پاتا ہے۔اپنے ویران و بے آباد گھر کو اسکول میں تبدیل کرنے کے بعد اسے طمانیت محسوس ہوتی ہے اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ بھی سر اٹھا کر جینے کے قابل ہو گیا ہے۔اس کا دل میں غریبوں سے محبت اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔وہ اس بات پر خوشی محسوس کرتا ہے کہ اس کے کھولے گئے اسکول سے غریب اور متوسط لوگ سبھی مستفید ہو سکیں گے۔اگر چہ اس کا باپ پہاڑوں پر لڑتا ہوا مارا گیا ہے مگر وہ بھی جنگ لڑے گا اپنے باپ کی طرح جذباتی ہو کر بندوق سے نہیں بلکہ علم کی تلوار سے اسی لڑائی کے توسط سے اپنے حقوق حاصل کرے گا۔

> "وہ چاہتا تھا کہ اب کی بار پہاڑوں کی بجائے شہروں میں لڑا جائے۔بندوق سے نہیں قلم سے ۔علم کے زور سے ۔چیونٹی پہاڑ سے لڑ سکتی ہے اگر پہاڑ جتنی طاقت حاصل کر لے ۔سول نافرمانی سے ۔جمہوری جنگ سے اسمبلی کے اندر میڈیا کے زور سے اور حقوق کے لیے لڑنا تو جہاں ہے۔"(12)

ناول میں ایک اہم کردار ڈاکٹر سرور کا ہے جو ہمدرد اور پر خلوص انسان ہے جس کے چہرے پر کرشن بھگوان والی ازلی و ابدی مسکراہٹ رقصاں رہتی ہے۔وہ کراچی میں پریکٹس کرتا ہے۔جہاز میں سفر کے لیے پہلے اس کو ئٹہ جانا پڑتا پھر کراچی،وقت کے زیاں سے بچنے کے لیے وہ کوچ کے سفر کا انتخاب کرتا ہے۔ڈاکٹروں کی کمائی وقت ہی سے طے ہوتی ہے اس لیے وہ رات کو کوچ میں بیٹھتا اور علی الاصبح حب کی حدود میں داخل ہوتا۔اسٹیٹس سے قطع نظر وہ کوچ کے سفر کو اہمیت دیتا ہے۔کوچ میں بیٹھے مسافروں کی اکثریت اس حقیقت سے ناآشنا تھی کہ ان کے درمیان ایک کامیاب سرجن محو سفر ہے۔اسی کوچ کی توسط سے اس کی دوستی رحمان سے ہوئی۔وہ رحمان کا پر خلوص دوست تھا جو ڈاکٹروں اور طب کے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کی نفسیات سے اسے آگاہ کرتا۔بیلہ کا اصلی چہرہ دکھانے کی سعی کرتا ہے ۔فلسفیانہ طریقہ کار اختیا کر کے رحمان کو سمجھاتا ہے کہ بیلہ سے محبت کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر اس محبت میں مجنوں والی کیفیت اپنا کر ذہنی بیماری کا روگ نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ بیلہ اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔وہ اسے تباہ کر دے گی۔اسے اپنی کامیابی کے لیے،حفاظت کے لیے محض ایک سیڑھی درکار ہے اور وہ رحمان سے اسی سیڑھی کا کام لے رہی ہے۔ایک اسپورٹنگ عاشق کی ضرورت ہے،ایک محافظ کی ضرورت ہے جو اسے وقتی تحفظ دے سکے۔کامیابی کے بعد وہ اسے دھتکار کر اپنے طبقے کے کسی نوجوان کے ساتھ شادی کرنا پسند کرے گی

،اگر اپنے طبقے سے کوئی شخص نہ ملا تو پھر ایک ڈرائیور کے برعکس ٹھیکیدار یا پھر کسی امیر عمر رسیدہ کے ساتھ شادی کرنا اس کی اولین ترجیح ہو گی۔

"بیلہ تم سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔وہ اپنا مستقبل بنا رہی ہے۔وہ اپنے کسی ہم عمر ڈاکٹر سے شادی کرے گی تاکہ دونوں مل کر دولت کمائیں۔" (13)

ڈاکٹر سرور میڈیکل کالج کو ایسی لڑکیوں کا پولٹری فارم قرار دیتا ہے جہاں وہ اپنا شوہر تلاش کرتی پھرتی ہیں۔اس ناول میں بیلہ کا کردار ایک ایسی عورت کا تعارف کرواتا ہے جو خود غرض ہے،لالچی ہے، مہنگے تحائف اور روپیہ پا کر مسرت محسوس کرتی ہے۔

"روپیہ اور زیور اس کا موڈ بدل دیا کرتے۔" (14)

رحمان سے پچاس ہزار کی رقم حاصل کرنے سے پہلے اسے بس اڈے کے اپارٹمنٹ میں جانے پر تامل تھا جہاں بیلہ کوچ کی طرح اس کے قبضے میں آجاتی،اسٹرینگ کی طرح جہاں موڑو جیسے تھراٹل دو جیسے کاٹو،اس کی نسبت وہ ریسٹورنٹ جانے کو ترجیح دیتی مگر اب وہ وہاں جانے کے لیے خوشی سے رضامند ہوئی۔اس کی محبت تہذیب کی رسوم و قیود کی پابند نہیں ہے، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجو صحت مندانہ جذبہ اظہار کے برعکس سطحی طریقہ کار اپنا کر نسوانیت کو مجروح کرتی ہے۔دھوکے بازی اور دو نمبری اس کی شخصیت کے ہر پہلو سے عیاں تھی۔ روپیہ کمانا اس کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔بلوچستان میں دوسرے خطوں سے آنے والوں نے کہیں اپنے ذاتی اثر رسوخ سے تو کہیں کسی اور غیر قانونی ذرائع سے ڈومیسائل بنوائے۔اس ناول میں اس سماجی المیے کو بھی غیر محسوس انداز میں اجاگر کیا گیا۔بیلہ کی زندگی کا ایک مشن یہ بھی تھا کہ وہ اپنے خاندان کا ڈومی سائل بنائے،اس کی بہنوں کے پروفیشنل کالجز میں داخلے ہوں۔ماں کا علاج کرائے اور بہنوں کی شادیاں ہوں۔رحمان سے شادی کی صورت میں ترقی کے تمام خواب ادھورے رہتے۔وہ ترقی خواہ کسی بھی تخریبی عمل کی صورت میں کیوں نہ ملے۔محبت کے بارے میں اس کا فلسفہ کچھ مختلف تھا:

"میں تم سے محبت تو کرتی ہوں، میں تمھاری ہوں۔مگر باقاعدہ شادی کر لی تو تم مجھے ملازمت نہیں کرنے دو گے۔چادری پہنا کر گھر میں بٹھا دو گے۔مجھے غیر قانونی DNC بھی نہیں کرنے دو گے۔میرا گھرانہ کیا کرے گا۔روپیہ کہاں سے آئے گا۔" (15)

آغا گل سماجی ڈھانچے کو بدلنے کا خواہاں ہے۔وہ دولت کی مساوی تقسیم چاہتا ہے۔جس کا اظہار اس کے افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے۔رحمان اسکول کھولتا ہے تاکہ نوجوانوں کی سوچ بدلی جاسکے۔اس کا کردار کامریڈ بائیں بازو کی سوچ رکھتا ہے۔اس کے کردار یوٹرن لیتے ہیں۔نیکی اور بدی کی کشمکش،خوب وزیشت کے عوامل سے برسرپیکار ان کرداروں کو خوبیوں اور خامیوں کا مرقع کہا جاسکتا ہے۔بعض کرداروں کی خوبیاں ابتدا سے ہی سامنے آتی ہیں،لیکن وہ کردار جو خوبیوں اور خامیوں کے تاروپود سے بنے ہیں انہیں رفتہ رفتہ کھول کر سامنے لاتے ہیں۔عموماناول کے نقطہ عروج پر اچھائی،برائی پر غالب آجاتی ہے اور کرداروں کی شفافیت جھلکتی ہے۔ایسی ہی صورت حال بیلہ کے کردار میں دکھائی دیتی ہے۔انسانی خوبیوں اور برائی کے مرقع اس کردار میں زیادہ تر برائی ہی دکھائی دی مگر رحمان کی محبت اور خلوص پانے کے بعد وہ بھی اس کے ساتھ اتنی ہی پر خلوص ہوتی ہے اس حقیقت کا ادراک قاری کو اس وقت ہوتا ہے

ناول کا اختتام کرب پر ہوتا ہے۔بلوچستان کی تہذیب وثقافت سے کو اپنے اندر سمیٹتے اس ناول میں سفر نامے کی خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں قاری اس کا مطالعہ کرتے وقت سفر نامے کا حظ اٹھاتا ہے۔ناول کے واقعاتی ترتیب میں انہوں نے کوچ اڈے سے لے کر کوئٹہ سے کراچی سفر کے حالات،واقعات،چینکی ہوٹلوں،پہاڑی سلسلوں،موسمی حالات،ویرانے،تباہ حال کچی سڑکوں،راستے میں آنے والے،ساتھ چلنے والی دیگر کمپنیوں کے کوچوں کا شور،پتھر اڑاتے کوچ،مزارات اور راستے کے نشیب و فراز،چیک پوسٹوں،ندی نالوں،خضدار،نمانی،یارو،بیلا،ویندر،اوتھل سے سمندری ہوائوں کے کوچ سے لپٹنے،گڈانی چوک،بھوتانی کی آبادی،سڑک کے کنارے نیم تاریکی میں غم زدہ زرد روشنیوں میں اونگھتے چائے کے ہوٹل،ہائی پر کھلی اکادکادکانوں،ٹائروں کی دکانوں پر ٹھپ ٹھپ کرتی ہوا بھرنے والی مشینوں،ویرانوں میں ایستادہ مسجدوں،پتھریلے علاقے،اردوگرد پھیلی اڑتی بکھرتی سمندری ریت،حب،لیاری،کراچی،واپسی پر کوئٹہ سے ،خضدار،جھالاوان کے پہاڑوں،تور گز کے جنگلوں،ویارو،انجیرئہ،لاکھوریاں،باغبانہ،وڈھ کا علاقہ ،قلات،ہنجہ سوراب،زہری کراس،کھڈکوچہ مستونگ،میاں غنڈی،ڈبل روڈسے سریاب روڈ،گگڑی،تھانہ سونا خان،چلتن پہاڑ،لکپاس کی تنگ گھاٹیوں میں چڑھتی چڑھائیاں،،ہزار گنجی،بابو شورش کا علاقہ ،بلوچستان کا کاسی قبرستان،ڈبل روڈتمام حالات وواقعات کا ذکر مشاہدے اور تجربے سے اکھٹی کی گئی معلومات پر ہے۔اس سفر کے دوران وقتاً فوقتاً مختلف افراد کا بھی ذکر آتا ہے جنہیں ہم کرداروں سے تعبیر کرسکتے ہیں۔جیسے کراچی میں سبزی منڈی کا منشی،چیک پوسٹوں پر ڈیوٹی دیتے پوسٹ گارڈ،ٹریفک پولیس،مقابلہ کرتے دیگر کوچ کمپنیوں کے ڈرائیور،ہوٹلوں میں

کھانا اور چائے سرو کرتے ملازمین جو اپنے مکالموں سے، مقامی رہن سہن، داخل اور خارج کا بہترین امتزاج اس ناول میں سفر نامے کی کیفیت کو جنم دیتا ہے

ناول بیلہ حقیقت نگاری کا شاہکار ہے۔ کرداروں کی مقامیت، کوئٹہ کا ماحول اس کے گرد و پیش کے مناظر، کوچ کمپنی سے وابستہ افراد کے طور اطوار کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ان افراد کی گفتگو، عمل کی معرفت اور اس کی زندگی کے محرکات کے تمام پہلو کو سامنے لاتے ہیں جس سے ناول میں معاشرتی حقیقتوں کے پردے چاک ہوتے ہیں۔

بلوچستان میں غیر ملکی تخریبی کاروائیوں کا اثر منفی سرگرمیوں میں ملوث افراد کی حرکات و سکنات سے دکھائی دیتا ہے۔ آغا گل ان افراد کی حقیقی کیفیت کی عکاسی فنکارانہ انداز میں کرتا ہے۔ یہاں وہ باریک بینی، مشاہدے کی وسعت، فنی بصیرت سے کام لیتے ہوئے مختلف النوع اور متضاد ریزے ریزے جوڑ کر موقع محل کے مطابق دہشت گردانہ منفی حالات کی تصویر کشی کرتے ہیں جو ان بیرونی طاقتوں کی بلوچستان میں دخل اندازی کے سبب اس کیفیت کو ابھارتی ہے جو یہاں سے ہی منسوب ہے۔ قبائلیت کا گہرا عکس، مجرمانہ طرز عمل اور زندگی کی علامات کا تصور زیادہ موثر انداز میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

مرکزی کرداروں اور بااثر شخصیات کے منفی کرداروں کے علاوہ ملازموں اور وقتی طور پر ابھر کر سامنے آنے والے کرداروں کی جزئیات نگاری، مقامی انداز میں پائی جاتی ہے جو اس ناول میں منظر نگاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مختلف کرداروں کی جزئیات نگاری سے ناول میں حقیقت نگاری کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ ناول کی کہانی میں ابتدا، وسط اور اختتام پر ایک موڑ ہوتا ہے۔ آغا گل کہانی میں یہ موڑ لانے کے لیے کہانی کے درمیان میں جزئیات نگاری سے واقعات کو مسلسل پیش کرتے چلے جاتے ہیں اس طرح جزئیات میں ایک باہمی ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئٹہ کی مارکیٹوں کی سیر ودود شاہ مارکیٹ، اسی طرح کراچی کی ہول سیل مارکیٹ، تین تلوار کے پاس گلف مارکیٹ، طارق روڈ ایسی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں جن سے احساس ہوتا ہے کہ یہ مناظر ماورائے حقیقت اور متخیل میں آباد نہیں ہیں بلکہ یہ وہ ماحول ہے جس میں اپنے عہد کی تہذیبی روایت بھی ہے اور وحدت بھی جو کراچی سے کوئٹہ تک باآسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔

انہوں نے اپنے ناولوں میں جس طرح پشتو، بلوچی، براہوی الفاظ کو برتا ہے یہ الفاظ کھٹکنے کی بہ جائے ایک نئے لسانی تجربے کے تناظر کے ساتھ ساتھ پڑھنے میں لطف دیتے ہیں۔ ان الفاظ میں اکثر اوقات فطری ظرافت بھی جھلکنے لگتی ہے۔ ممکن ہے یہ طریقہ تحریر

دیگر خطوں کے قارئین کے لیے کھردرا اور مشکل ہو سکتا ہے مگر بلوچستان میں رہنے والا قاری ان الفاظ، ماحول، مناظر، کاروبار زندگی سے آشنائی کی بدولت خاص حظ اٹھاتا ہے۔ یہاں کے قارئین کو اس طریقہ تحریر سے کہانی میں فطری بہاؤ محسوس ہوتا ہے۔ سات زبانوں کے رنگ میں رنگے واقعات کڑی در کڑی خوبی کے ساتھ ایک دوسرے میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں اور ناولوں میں دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔

ناول نگاری ایک مشکل فن ہے۔ انہوں نے اس فن کو بہ حسن وخوبی برتا ہے۔ ان کے ناولوں کا بلوچستان کے ماحول اور زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بلوچستان کے ذرے ذرے، مناظر، مقامات، آثار و کوائف سے گہری محبت ہے، وہ پاکستانی اور مغربی ادیبوں کا موازنہ کرتے وقت یہاں کے ادیبوں کے حوالے سے برتی جانے والی بے اعتنائی پر کوڑھتے ہیں۔ برٹنڈ رسل اور سارتر جیسے مفکرین جنہیں حکومتی سرپرستی اور آزادی رائے حاصل ہے۔ جب کہ یہاں کے لکھاری رضاکارانہ چندہ سے کتابیں چھپوا کر عید قرباں کے گوشت کی طرح بانٹے پھرتے ہیں۔ جنہیں سرکار نے صرف محبت کے موضوع پر لکھنے کی اجازت دے رکھی ہے سیاسی یا مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والوں کے فکشن، ڈراموں اور فلموں پر پابندیاں عائد ہوتیں ہیں۔ بسا اوقات اس کی پاداش میں ملک تک چھوڑنا پڑتا ہے۔ انہوں نے ان تمام سرکاری پابندیوں سے بے نیاز ہو کر لکھا۔ ان کے ناولوں میں سیاسی، مزاحمتی، اصلاحی، مزاحیہ، رومانی، جمالیاتی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی اور طبقاتی جدو جہد اور عالمی رجحانات مل جل کر ناول کی روایت کو مستحکم بناتے ہیں اور ناولوں میں جدت کے تصور کو اجاگر کرتے ہیں۔

کیفیت بھی ملتی ہے۔

حوالہ جات

1) فاروق احمد، ڈاکٹر، "بیسویں صدی میں بلوچستان کا ادب"، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2006ء) ص253

2) منزہ جبین، "آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب و ثقافت"، (کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز، 2014ء)، ص60

3) آغا گل، "بیلہ"، (کوئٹہ: قلات پبلیشرز، طبع سوئم: 2008)، ص18

4) آغا گل، ایضا، ص27

5) آغا گل، ایضا، ص27

6) آغا گل، ایضا، ص27

7) آغا گل، ایضا، ص117

8) آغا گل، "ایضا، ص43

9) آغا گل، ایضا، ص67

10) حبیب الرحمن، "بلوچستان میں اردو فکشن،"(لاہور: مشمولہ سپوتنک جلد نمبر29، 2018ء، شمارہ 11)، ص129

11) عبادت بریلوی، ڈاکٹر، "اردو تنقید کا ارتقا،"(کراچی : انجمن ترقی اردو پاکستان، طبع پنجم:2001ء)، ص148

12) آغا گل، "بیلہ "،(کوئٹہ: قلات پبلیشرز، طبع سوئم:2008)، ص93

13) آغا گل، ایضا، ص76

14) آغا گل، ایضا، ص108

15) آغا گل، ایضا، ص101

References

1.Farooq Ahmad,Doctor," Besween sadi main Balochistan ka Adab",
(Islamabad: Muqtdrah Qomi zaban,2006) ,p 253

2. Munza Jabeen, "Agha Gul k fiction main Balochistan ki thzeeb o saqafat ",(Karachi: Rangy Adab, Publications,2014) ,p 60

3. Agha Gul," Bela",(Quetta:Kalat publishers,Taba soyaim:2008),p 18

4. Ibid, p 27

5. Ibid, p 27

6. Ibid, p 27

7. Ibid, p 117

8. Ibid, p 43

9. Ibid, p 67

10. Habib ur Rahman," Balochistan main urdu fiction",(Lahore: Mashmoola Sputnik,Jild no 29,2018 Shumara11), p,129

11. Ibadat Barelvi, Doctor," Urdu Tanqid ka Irtiqa",(Karachi:Anjumne Trqi urdu pakistan,Taba panjum: 2001),p 148

12. Agha Gul," Bela",(Quetta:Kalat publishers,Taba soyaim:2008),p 93

13. Ibid, p 76

14. Ibid, p 108

15. Ibid, p 101